قرآنِ حکیم اور علمی نظریات

(۲)

محمد آفاق صاحب صدیقی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

اب ذرا آئیے، قرآنِ حکیم کے سماجی اور معاشی مسلمات کو دیکھیں۔ میں یہاں شادی اور افزائشِ نسل سے متعلق بنیادی حقائق کا ذکر کروں گا۔

مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر شخص کا رزق اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ اس عقیدے کے تحت خراب اقتصادی حالت میں بھی شادی کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ عورت اپنا رزق خود لے کر آتی ہے۔ ہر شخص اپنے مقدر سے کھاتا ہے۔ اس پر اگر کسی کا ایمان نہیں ہے تو وہ کافر ہے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں قرآن حکیم نے مندرجہ ذیل آیت میں:

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۔ (جن کو نکاح کا مقدور نہیں ہے انہیں چاہئے کہ ضبط سے کام لیں، یہاں تک کہ اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے) میں جو بات کہی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ جس طرح غنی کو چار شادیوں کی مشروط رخصت دی گئی ہے، اسی طرح مفلس کو صرف ایک شادی سے بھی اجتناب کا مشورہ دیا گیا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں اقتصادی حقائق کے پیشِ نظر فیصلے کئے گئے ہیں۔ معاشی اور اقتصادی صورت حال کے تحت منع حمل کی جو مہم

حکومتوں نے شروع کی، اس کی علماء مذاہب نے بہت شدید مخالفت کی۔ مسلم علماء نے سورۂ انعام کی آیت ۱۵۱ وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ خَشْيَةِ اِمْلَاقٍ ط کو جواب میں پیش کیا، اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو کافر ٹھہرا دیا، اور منع حمل کی تحریک کو اسلام دشمن حکومتوں کی سازش قرار دے کر مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ وہ اس سازش کا شکار نہ ہوں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں :-

> مالتھس نامی ایک ماہر معاشیات جو برطانیہ میں ۱۹ ویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے اور قتل اولاد یا منع حمل کی تحریک اصلاً اسی کی چلائی ہوئی ہے اس کے سارے نظریہ کی بنیاد یہی خوف افلاس و ملک ہے[۱]

اور لفظ اَوْلَادَكُمْ کو نطفہ کے برابر قرار دے لیا۔ یہ بات بالکل ایسی ہے جیسے کوئی انڈے کو مرغی تسلیم کرلے۔ منع حمل کو قتل اولاد کہنا کتنا بڑا مغالطہ ہے۔ اس بات کا ایک اشارہ تو مفلس ہونے کی صورت میں شادی سے اجتناب کرنے والے حکم ہی میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ شادی کی غرض افزائش نسل ہی قرار دی گئی ہے۔ افلاس اگر شادی کرنے میں مانع ہو سکتا ہے تو افزائش نسل کی حوصلہ افزائی کیسے کر سکتا ہے۔ جس طرح منکوحہ کی کفالت کی صلاحیت نہ رکھنے پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح اولاد کی افزائش کے لئے بھی اس وقت تک آدمی کو صبر کرنا چاہیئے۔ جب تک انکی کفالت کا بار اٹھانے کے قابل نہ ہو جائے۔ وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ کے لفظی معنی پر اصرار کر کے وہی صورت حال پیدا کر دی گئی تھی جو بائبل کے عالم پیدا کیا کرتے تھے لیکن یہ مغالطہ اب دور ہو چکا ہے۔ آج کا مسلمان اس ذہنی اور ایمانی انتشار سے نجات پا چکا ہے جو قرآن کے اس طرح کے مفاہیم سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

۱۔ تفسیر ماجدی صفحہ ۳۱۹۔

(پلیسٹینا) انول ورے حیوان لبونی کی ابتدار ،	۱۳ کروڑ سال
لیمرس (LEMURS) کا وجود ،	۷.۰۵ " "
جدید سلسلۂ حیوان لبونی (گھوڑے) کی ابتدار ،	۵.۰۵ " "
بندر ،	۳.۰۴ " "
انسان نما بندر ،	۲.۰۵ " "
انسان ،	۱.۰۲ " "
انسان کا صوری ارتقار ،	۰.۰۵ سے ۰.۰۶ " "
انسان جدید ،	۲۵ ہزار سال ،

رحم گیتی میں جو تخم حیات رکھا گیا تھا ۔ اس نے خلقاً آخر کی صورت اختیار کرنے میں تقریباً ۴ ارب ، ۵۱ کروڑ ، ۵۸ لاکھ ، ۴۰ ہزار کی مدت طے کی[1]۔ شکم مادر میں نطفہ انہیں منازل سے صرف ۲۸۰ دنوں میں گذر کر خلقاً آخر کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے اگر ان ارتقائی منازل کے زمانی تفاوت کا مقابلہ کیا جائے ، تو احسن الخالقین کی زمان و مکان پر قدرت کا ایک عقلی اندازہ ہو سکتا ہے ،

رحم مادر کے ۲۸۰ دن ،	رحم گیتی کے ۴,۵۱,۵۸,۴۰,۰۰۰ سال ،
اس طرح رحم مادر کے ۱ دن ،	" " " ۱,۶۱,۲۸,۰۰۰ "
" " ۱ گھنٹہ	" " " ۶,۷۲,۰۰۰ "
" " ۱ منٹ	" " ۱۱,۲۰۰ "
" " ۱ سکنڈ	" " " ۱۸۷ "

(1) CLEKELAND P. HICKMAN . LUTEGRATED . PR[INCIPLES OF ZOOLOGY] -ICIPLES OF ZOOLOGY . PNEF . OF . ZOOLOGY D[E]PAW · UNIVERSITY . JWDHANA . U . S . A

مندرجہ بالا تقسیم وضرب محض انسانی عقل کے اندازہ کے لئے ہیں، جدید تحقیقات
مذکورہ بالا تنا سب کو مزید بڑھاتی جارہی ہیں۔ جدید ماہرین حضرات (PALEONT-
OLOGISTS) کے نزدیک زمین پر حیات کے وجود کا زمانہ ۳ ارب سال سے کہیں زیادہ
نکل سکتا ہے۔ بڑھنے کے سوا کم ہونے کا امکان نہیں ہے۔ ۱۹۵۲ء تک کہکشاں کو جتنی دور
سمجھا جاتا تھا ۱۹۶۵ء میں یہ معلوم ہوا کہ اصل فاصلہ پہلے والے فاصلہ سے دوگنا زیادہ
ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ زمان ومکان کے یہ اندازے علم کی وسعت کے ساتھ زاویہ
کی لکیروں کی طرح وسیع تر ہوتے جائیں گے، یہ مدتیں، یہ دوریاں غیر حقیقی ہیں۔ جو خود دائمی
اور ازلی ہو اسکے نزدیک وقت کی انسانی تقسیم بالکل مہمل ہے۔ لیکن قرآن لاہوتی اور ناسوتی
زمانہ کے فرق کو عام انسانی فہم کے اندازہ کے مطابق بیان کرتا ہے۔ مثلاً:-

ایام لاہوتی :- خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۔ (خدا نے زمین وآسمان
کو چھ دنوں میں پیدا کیا)

شمار ناسوتی :- اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (آپ کے
رب کا ایک دن آپ لوگوں کے ایک ہزار سال کے برابر ہے)، (القرآن المجید الحج ۴۷)

یہاں جن چھ دنوں کا ذکر آیا ہے، ان کو ایام ارضی تصور کرنا سراسر جہالت اور کج فہمی
کی بات ہوگی۔ یہ وہ دن ہیں جن کی نسبت براہ راست احسن الخالقین کی ذات عالی سے ہے
بائبل کے عالموں اور معتقدین نے انہیں ۲۴ گھنٹوں والے چھ دنوں کی طرح تسلیم کرنے پر زور دیا
نتیجہ کے طور پر ارباب علم نے اس کا مذاق اڑایا۔ حالانکہ اگر وہ ذرا سی کوشش کرتے تو ان
کی سمجھ میں بھی یہ بات آجاتی کہ یہ وہ دن ہیں جو تخلیق ارض وسمٰوات سے قبل کے پیمانے ہیں
جن کی وسعت کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ قرآن کے مفسرین نے ایام کے مفہوم کو
لغت کے اعتبار سے زمانوں کے معنی میں قبول کرکے قرآن کے وقار کو برقرار رکھا
اس طرح کائنات کی تخلیق کو رب العالمین کے اندازہ کے مطابق چھ زمانوں میں مکمل

ہوا سمجھا ۔ اور ان چھ ناموں کے اظہار کی ضرورت کو یوں محسوس کیا کہ پروردگار عالم یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ کام عجلت میں نہیں کیا گیا بلکہ اس کا بھی ارتقار ہوا ہے ۔ اگر قرآن کے ماننے والے بائبل کے معتقدین اور مبلغین کی طرح ان دنوں کو دوشنبہ سے سنیچر تک کا وقفہ مان لینے پر ہی مصر رہتے تو قرآن کا وہی انجام ہوتا جو بائبل کا ہوا ہے ، کریگ (CRAGG) نے بہت واضح طور پر قرآن کی تمام مذہبی کتابوں پر فوقیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے :

BY VIRTUE OF

BY VIRTUE OF IT (QURAN) MUSLIM ARE VILORPORATAD AS THE LOOK CAUT-VED COMMNITY ISLAM IS TTUS THE WORED S MOST STIKUIG EKPESSION OF IWLOT MIGW LE CALLD DOEUMEN-TATY FAITH . (1)

فہم و فکر سے کام لینا بند کر دیا جائے ، تو انسانی ذہن کا نشو و نما ہی بند ہو جائیگا آدمی اگر ارادی طور پر فکر نہ بھی کرنا چاہے تو بھی حالات اسے سوچنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں ، تمام محسوسات اور معقولات کسی نہ کسی درجہ میں انسانی فہم و فکر کے لئے سوالیہ نشان بن جاتے ہیں ۔ کائنات میں جو نظم قائم ہے اس کی کڑیاں اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ ہر کڑی دوسری کڑی کے سوال کا جواب فراہم کرتی ہے ۔ بیشتر دماغ جب ان کڑیوں کا ادراک نہیں کر پاتے تو طرح طرح کی قیاس آرائیوں سے اس

---

(1) KENN ETH CRAGG : THE MIND OF QURAN 1973 (LORVM)

خالی جگہ کو پُر کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہی قیاس آرائیاں "نظریات" کہلاتی ہیں، ایسے تمام سیمابی تصورات کے لئے ہر وقت قرآن سے تائید تلاش کرنا ایک مضحکہ خیز عمل ہے۔ لیکن جہاں تک حیات، ممات اور کائنات کے مسلمات کا تعلق ہے قرآن اس سلسلے میں بہت واضح ہدایت دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے:-

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا

اور بے شک ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے مضمون طرح طرح سے بیان کئے ہیں لیکن اکثر لوگ انکار کئے بغیر نہ رہے۔ (القرآن المجید، بنی اسرائیل ۸۹)

ہر قسم کے مضامین کے طرح طرح سے بیان کی بظاہر تو کوئی وجہ بتائی نہیں گئی لیکن بہت آسانی سے یہ بات عقل میں آتی ہے کہ چونکہ لوگ ایک سی عقل و نظر نہیں رکھتے اسی لئے مضامین کو طرح طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن کو سمجھنے کا صرف ایک ہی طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ طرح طرح سے اسے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ جدید ذہن جدید معنی کا متلاشی ہوتا ہے جب تک اسے وہ معنی نہیں ملتے وہ مطمئن نہیں ہوتا تلاش معنی کی جد و جہد میں یونانی فلسفیوں نے جہاں بہت اہم غلطیاں کی ہیں وہیں ان کا یہ انکشاف بہت عظیم ہے کہ انسان کے اندر جو نظم قائم ہے وہ نظم کائنات کا خلاصہ ہے۔ یونانی اصطلاح میں اسے (MICRO-COSM) یعنی جہان اصغر کہا جاتا ہے، چونکہ نظم کائنات یعنی (MACRO-COSM) جہان اکبر کے مطالعہ کی وہ سہولیات جو آج میسر ہیں وہ انہیں فراہم نہ تھیں اس لئے انہوں نے جہان اصغر کے مطالعہ کو کافی سمجھا۔ اس مطالعہ سے ان پر جو انکشافات ہوئے اس میں چند کو چھوڑ کر بیشتر نے انسان کو دیوتاؤں کا کھلونا سمجھا اسے بے حد لاچار اور مجبور ثابت کیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ماحول پر اس کا اپنا کوئی اختیار نہ تھا۔ "مجبور" سے "مختار" تک پہونچنے میں ہزاروں برس کا فاصلہ

درپیش تھا لیکن انبیاء علیہم السلام کی آمد برابر "جبر و اختیار" کی حدود کی نشاندہی کرتی رہی اور مقام آدم کو بلند سے بلند تر کی جانب اٹھانے کا تصور پیش کرتی رہی ہے جس کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ آدمی خود اپنے خالق سے قریب تر محسوس کرتا رہے۔ کیونکہ خالق کا اپنی مخلوق سے قریب تر ہونا اخلاقی نظام کی شیرازہ بندی کے لئے بہت ضروری ہے۔ خدا کو اپنے سے دور کر لیجئے پھر دیکھئے انسانی معاشرہ کا شیرازہ کتنی تیزی کے ساتھ منتشر ہوتا ہے۔ مغرب کی موجودہ سوسائٹی کا عبرت آموز انجام ہماری نظر میں ہے۔ اسی فطری اور نفسیاتی جذبہ کی تسکین کے لئے قرآن کریم نے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْکُمْ مِّنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کہہ کر دوری کی ہر ممکن تصور کی جڑ ہی کاٹ دی قدیم مذاہبی تصورات کے مطابق خدا کو اپنے مکان سے باہر آنا جانا پڑتا تھا وہ، سورج سے اتر کر چاند میں آتا تھا پھر وہاں سے بادلوں میں آجاتا حتیٰ کہ آندھیوں پر سوار ہو کر زمین کو چھوتا ہوا گذر جاتا تھا، چونکہ بیشتر اوقات اسے اس کا عتاب اور غصہ زمین کی جانب آنے پر آمادہ کرتے تھے، اس لئے آندھی اور طوفان اور زلزلے اس کی آمد کی علامتیں قرار پاتی تھیں، یہ سب انسانی نفسیات کے پہلو تھے۔ جو آدمی نے خدا سے منسوب کر دیے تھے، غصہ اور عتاب کی حالت میں آج کا مہذب آدمی بھی گھر سے فوراً باہر نکل جاتا ہے یا نکل جانے ہی کو فوراً ترجیح دیتا ہے۔ مذکورہ ارضی اور فضائی تغیرات جیسے آندھی اور زلزلے وغیرہ انسان کو خدا کے قریب ہونے کا احساس دلاتے تھے۔ تمام مذاہب عالم میں خدا کو آدمی سے بہت قریب بتلایا گیا ہے۔ اس قربت کا بعض جگہ تو یہ عالم ہے کہ انسان ہی کو نہیں بلکہ ہر شئی کو خدا قرار دیا گیا ہے۔ ویدانت کا فلسفۂ وحدۃ الوجود اس کی واضح دلیل ہے۔ ویدانت کی تعلیم کے مطابق دوری کا تصور ہی ناپید ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جب ہر شئی خدا ہے تو غیر خدا کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن فطرت انسانی کو اپنے وجود کا خاتمہ کبھی تسلیم

نہیں ہوا ہے ۔ اسی لئے اس طرح کا ویدانتی یا فلاطونی فلسفہ صرف عالم جبر اور بے بسی میں ہی آدمی نے قبول کیا ہے ۔ یہ جبر کبھی سیاسی رہا اور کبھی معاشی۔ انہیں دونوں صورتوں میں اس طرح کے فلسفہ کو فروغ ملا ہے اور خانقاہوں، مٹھوں اور راہب خانوں کے وجود کو تقویت پہونچی ہے :-

سائنس کے فروغ نے مذہبی ذہنوں کو سب سے پہلے اس بات کے انکشاف سے متاثر کیا کہ خدا آدمی سے اس کے تصور سے کہیں زیادہ دور ہے پہلے وہ اس کی آواز اور دعاؤں کی حد میں تھا۔ لیکن اب وہ ایسے مقام پر ہے جہاں تک انسانی آہ و فغاں کی رسائی محال ہے۔ گمان گذرا کہ وہ چاند، ستاروں میں چلا گیا ہوگا۔ مگر کچھ دنوں بعد یہ مفروضہ مساکن بھی ویران نے ثابت ہوئے۔ اس علمی حقیقت نے انسانی دلوں کو کمزور کر دیا۔ دعاؤں پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس کے عتاب کا ڈر بھی کم ہونے لگا حتیٰ کہ وہ منزل آگئی کہ ۱۹ صدی یورپ کے ایک مفکر کو یہ کہنا پڑا کہ خدا مر گیا ہے لہٰذا اپنے حال و مستقبل کی خود خبر لو، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو۔ !، ایسا کہنے کی وجہ یہ تھی کہ حد نظر سے دور ہونے اور مردہ ہونے میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ خداؤں کے قیام سکونت کی بھی جگہیں متصور تھیں ان سب پر آدمی کے نقش پا کی مہریں لگتی چلی جا رہی ہیں ۔ ہمارے ملک میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کا دل چاند پر آدمی کی سیاحی کے کارنامہ کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اس لئے کہ ایسا تسلیم کرنے سے ان کا خدا غریب الوطن ہو جائیگا۔ سائنسی تحقیقات اور ٹیکنالوجی کے کمالات نے چاند سورج کے پجاریوں کے لئے شدید جذباتی انتشار کی صورتیں پیدا کر دی ہیں ۔ پہلے آدمی سے آدمی بہت دور تھا مگر اس کا خدا اس کی دعاؤں کے حد میں تھا۔ آج کی صورت بالکل برعکس ہے ۔ آج آدمی سے آدمی بے حد قریب ہے ۔ اور خدا حد تصور سے بھی دور چلا گیا ہے۔ آج جو قومیں اور جماعتیں

اس احساس کی زد میں آچکی ہیں مثلاً امریکہ اور یورپ کے بے شمار لوگ، وہ پھر آدمی سے دوری اور خدا سے قریب رکھنے کے آرزو مند ہیں۔ امریکہ میں عالموں کی ایسی جماعتیں موجود ہیں جن کے دستور میں ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلیویژن، کار اور ہوائی جہاز کے استعمال کو مردود قرار دیا جا چکا ہے۔ حتیٰ کہ اخبار اور رسائل کے مطالعہ پر پابندی ہے۔ کیونکہ یہی وہ ذرائع ہیں جو آدمی کو آدمی سے بہت قریب اور خدا کو دور سے دور تر کرتے جاتے ہیں۔ مغربی تہذیب نے اپنی معراج پر پہونچنے کے بعد پلٹ کر جب پیچھے دیکھا تو اپنی پستی کی گہرائی کو دیکھ کر اس کے پاؤں لرزنے لگے ہیں اور اسے یہ محسوس ہو رہا ہے اگر اس بلندی سے نیچے گرا تو انجام کیا ہوگا، اسی انجام کی ایک مختصر تصویر پروفیسر کامنر نے اپنے مذکورہ مضمون میں پیش کی ہے۔ اس انجام کا غالباً سب سے بڑا سبب آدمی کی اپنے اختیارات کو وسیع تر بنانے کی وہ بے پناہ خواہش ہے۔ جو جہان اکبر کے اسرار و رموز کو علوم شش جہات میں بدلنے کے لئے اسے ہر دم آمادہ کئے ہوئے رہتی ہے مگر اسلامی بصیرت کہتی ہے:۔

بچشم اہل نظر از سکندر افزوں تر ست
گدا گرے کہ سوال سکندری داند،

نیوٹن اور گیلیلیو کی تحقیقات نے پہلے خدا کو مکانی اعتبار سے دور کر دیا تھا۔ بعد ازاں ڈارون نے خالق اور مخلوق کے درمیان لطف و کرم کا جو سلسلہ تھا اس کے پرزے اڑا دیے، آدمی چونکہ خدا کے تصور کے بغیر جی نہیں سکتا اس لئے اس نے سنگ و آہن کے بجائے نظریات کے بت تراش لئے اور اس کی عبادت شروع کر دی۔

قرآن حکیم پر یقین رکھنے والے الحمدللہ اس طرح کے ذہنی اور قلبی انتشار کے کبھی شکار نہیں ہوئے۔ اپنے معتقدین کو وہ ہمیشہ تاریکی سے روشنی کی جانب راستہ دکھاتا رہا ہے

اور اس کا اپنے معتقدین سے ایسا ہی وعدہ بھی ہے اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ کا ازلی وعدہ اور اس پر لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ کی اٹل شرط نافذ ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب اپنے معتقدین سے اس طرح کا علاقہ نہیں رکھتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ زندگی کے کسی دور یا کسی گوشہ میں جب تاریکی پھیلتی نظر آتی ہے۔ تو قرآن حکیم سے روشنی بھی پھوٹ نکلتی ہے جو قاری مومن کو کفر اور نامرادی کے غار میں گرنے سے بچا لیتی ہے۔ قرآن حکیم نے حیوانات کے علاوہ نباتات کے ارتقار کا بھی ذکر کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی سے ابتدائی نباتات کا ظہور ہوتا ہے پھر اس کے بعد تنا ور ہونے اور بار آور ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ اور ان کی آخری صورتوں کا بھی اشارتاً ذکر موجود ہے۔ لیکن ذہنی ارتقا کی کوئی آخری منزل نہیں بتائی گئی اس لئے کہ ذہنی ارتقار انسان کی اپنی کوششوں پر منحصر ہے۔ جسمانی ارتقار کی ذمہ داری خالق نے پوری کر دی۔ اور ذہن کی ترقی کے لئے ہدایات فراہم کر دیں۔ اور وہ سب غور و فکر کی دعوتوں میں مضمر ہیں غور و فکر کا حاصل کیا ہوتا ہے؟ ہر فکر کا حاصل علم ہے۔ اور ہر علم خدا کی بزرگی ثابت کرتا ہے۔ مذہبی اور عبادت گذار لوگ سائنس کو خدا کا اور مذہب کا دشمن تصور کرتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی ضرب کاری اور نشانہ بیشتر صحیح ہوتا ہے۔ مذہبی لوگ اس کا ہدف بننے کے خوف میں بڑی الٹی، سیدھی بکنے لگتے ہیں۔ اور بعض لوگوں پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس طرح کا خوف سراسر بے بنیاد ہے۔ سائنس نہ تو خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور نہ اسے جھٹلانے کی۔ وہ صرف پچھلے علوم کو زیادہ سے زیادہ صحیح اور معتبر بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی اصل غرض و غایت اشیاء کی حقیقت کو سمجھنا ہے، اور طلسم شش جہات کو علوم شش جہات میں بدلنا ہے۔ خرافات کی راہ میں تو وہ ضرور حائل ہے۔ لیکن مذہب جس کی بنیاد بلند اخلاقی اقدار پر قائم ہے

اس کا سائنس سے کبھی تصادم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان دونوں کی حکومت اور میدان عمل بالکل جداگانہ ہیں۔ ایک کی حکومت ممالک اشیاء پر ہے۔ تو دوسرے کی ممالک اقدار پر۔ جس طرح اشیاء کے بغیر اقدار کا ہونا محال ہے اسی طرح علم کے بغیر یقین کا۔ علم جتنا ہی صحیح ہوگا یقین اتنا ہی پختہ ہوگا[1]۔ علم کا نقص یقین ناقص پیدا کرتا ہے۔ ثبوت کے لئے قدیم مذاہب کا مطالعہ کیجیے، تو ان کے اندر مہملات اور خرافات کی جو کثرت ملتی ہے اس کی واحد وجہ ان کے علم کا نقص تھا۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی چاہے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے وہ خدا اور حشر کے یقین کو ضرب نہیں پہونچا سکتی۔ رہا انسانی اقدار کا معاملہ تو جہاں تک آدمی اس کی پامالی قبول کریگا وہاں تک سائنس کا دخل ہوتا جائیگا۔ اگر آدمی کسی شئی کو صرف شئی محض تصور کرنے تو اقدار ختم ہوجائیں گی اور جب قدریں مٹادی جائیں گی تو وہ خود بخود سائنس کے حلقہ اختیار میں داخل ہوجائیں گی اس سائنس کی نہ تو کوئی عظمت ہے اور نہ اس کی نفرت، یہ تو ایک اصول اور ایک نقطۂ نظر کی فتح و شکست کا مسئلہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے مستقبل میں ایسی صورت حال کا امکان موجود ہے۔ کہ آدمی زمین کے علاوہ دوسرے ستاروں یا سیاروں پر قیام کرنے کی سہولتیں فراہم کرلے۔ اس امکان سے یا اس کے واقعی ہونے سے قرآنی صداقتیں کیا غلط ثابت ہوجائیں گی۔ بہت سے دلوں میں یہ اندیشہ گھر کر رہا ہے مگر فہم و فکر رکھنے والے دل و دماغ ان متصور اور ممکن حالات سے ہرگز مرعوب ہوکر

---

(1) THE CNEEPTION OFGOD GROWS EVER LIGLER AS OUR KNOD LEDGE OF HIS METHODS OUD THE SEBLE OF HIS WORKS IN CEASE (W.H. FITEHETT THE BELIEFS O THE LELIEF

اساس ذہن کو ٹھکرانے کو تیار نہیں ہوں گے۔ تمام کائنات خالق احسن کی نشانی ہے۔ قرآن کریم بھی اس کی عظیم نشانی ہے۔ یہ نشانیاں یا آیات اللہ کسی جادوگر کی نشانیاں نہیں ہیں۔ کہ خود اس کے خالق کو اس کو باقی رکھنے کی قدرت نہ ہو قرآن کریم خالق لازوال کی نشانی ہونے کی وجہ سے ہی، ابدی صداقتوں کو ہم آغوش کئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے اپنی جگہ ثابت ہے۔ انفس و آفاق میں بکھری ہوئی صداقتیں قرآن کی صداقت کی تائید کرتی ہیں

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ

(حٰمٓ السجدۃ ۵۳)

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں اور خود ان کی ذات میں دکھا دیں گے، یہاں تک کے ان پر یہ واضح ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے۔

آب و ہوا، عرش و فرش، جسم اور دماغ میں جو کچھ ہے وہ اللہ رب العزت کی عظمت اور اس کے حق ہونے پر پوری دلیل ہے۔ تمام انسانی علوم انہیں انفس و آفاق کے گرد گھومنے میں ان کی حقیقتیں اور صداقتیں جس قدر نکھریں گی قرآن حکیم کا مفہوم اتنا ہی واضح ہوتا جائے گا۔ مگر اتنا یاد رہے کہ علم کو ظن کے برابر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ خود قرآن کی زبان میں اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے) ہم کو قرآن میں ظن کی تصدیق و تائید کے لئے جستجو کرنے کا کوئی حق نہیں پہونچتا۔ اس لئے کہ اس کا ظن سے تو سروکار ہی نہیں ہے۔ وہ خود حق اور حق کی تائید کا دعویٰ کرتا ہے،

کائنات کی تین صورتیں ممکن ہیں۔ (۱) پیدائش سے قبل کی PRENATAL (۲) پیدائش کے بعد POST NATAL (۳) اور تیسری تکمیل حیات کے بعد

OST MORTEN قرآن حکیم نے ان تینوں صورتوں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ان صورتوں کو جو عقل انسانی کی گرفت میں باسانی نہیں آتی ہیں ان کو بار بار مثالوں کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا جلال الدین رومی نے سورۃ الواقعہ ۵۸ آیت: اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ خالق احسن کا یہ روزانہ کا معمول ہے کہ وہ تین فوجیں مختلف عالمین سے مختلف عالمین کی جانب روانہ کرتا ہے۔ ایک تو نر کی پشت سے مادہ کی رحم میں، دوسری رحم سے زمین کی جانب، اور تیسری زمین سے موت کی دیوار کے اُس پار ایک انہوں نے بھی تین طرح کے عالمین کی نشاندہی کی ہے۔ یعنی قبل الوجود، موجود، اور بعد الموت، اور یہی تین صورتیں ممکن بھی ہیں۔ انسانی علوم کا حال تو بقول شاعر ہے۔

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

لیکن علم قرآنی ان عالمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن کی ربوبیت کی ذمہ داری اس احکم الحاکمین نے لے رکھی ہے۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔

ایک تصور کے تحت زمین کائنات کا رحم ہے، انسان دوسرے جانداروں سے امتیازی خصوصیات حاصل کر کے تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ سال کے عرصہ میں آج کی منزل تک پہونچا ہے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو مادر گیتی نے اپنے شکم سے خلاء میں ایک ابن مریم کو جنم دیا۔ جس کا نام یوری گیگارن تھا۔ یہ تاریخ خلاء میں زمین کی پہلی اولاد کے وارد ہونے کی تاریخ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تاریخ اس بات کی شہادت بھی ہے کہ انسان کی جسمانی ارتقائی منزلیں ختم ہوگئیں۔ اور ذہنی ارتقاء کا عظیم دور شروع ہوا۔ یہاں جس عمل کو بچانے ولادت سے

تشبیہ دی ہے اسے اگر گیگارن کی خلا میں تلا بازیوں کی تصویروں کو سامنے رکھ
دیکھیں تو یقیناً آپ اس میں تولد ہونے کی صورت سے مماثلت پائیں گے۔ جو
بہت آسانی سے اس مماثلت کو نمایاں کرتی ہے۔ وہ گیگارن کے جسم سے بند
ہوا وہ آنول۔ UMBILICELCORD ہے جو آکسیجن کے لئے اسے اس کے
خلائی جہاز سے جوڑے ہوئے ہے۔ یعنی وہی آنول جو شکم مادر میں بچہ کے رشتہ
حیات کو اس کی ماں سے جوڑے رکھتا ہے۔ ولادت کے بعد جس طرح ایام رضاعت
میں بچہ اپنی ماں سے ملی ہوئی خوراک پر زندہ رہتا ہے۔ اسی طرح آدمی اب خلا
میں ان کے ایام رضاعت کے دن گذار رہا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ
اپنی خوراک کے لئے مادر گیتی پر منحصر نہ رہے۔ لیکن مادر گیتی سے اپنے جذباتی لگا
کو وہ فراموش نہیں کر سکتا چاہے وہ کہیں بھی رہنے لگے۔ اس ایام رضاعت یعنی
آکسیجن پر زندہ رہنے کی مدت کا ایک اندازہ کے مطابق ۱۶,۱۲,۸۰,۰۰۰
سال کے برابر ہوتی ہے۔ یہ اعداد اس وقت حاصل ہوئے ہیں جب صفحہ نمبر
دئے گئے ٹیبل کے حساب سے یہ فرض کر لیا گیا کہ اگر بچہ کے لئے صرف چھ ماہ
تک ماں کا دودھ ضروری ہو تو یہ ۱۸۰ دن ارتقائے حیات کے پیمانے والے کیلنڈر
دنوں کے برابر ہوں گے۔ میں نے یہ مفروضہ یہ ظاہر کرنے کے لئے پیش کیا ہے کہ اگر
اس طرح کے واقعات بھی رونما ہو جائیں کہ آدمی سیاروں میں رہنے کے قابل
جائے تو جب بھی قرآنی صداقتوں پر حرف نہیں آسکتا۔ قرآن کی صداقتیں تو اس
وقت غلط ہو سکتی ہیں۔ جب آدمی کو حیات و موت پر اختیار ہو جائے۔ وقت
اس کے حکم کے تابع ہو جائے۔ وہ آزاد مخلوق کی تخلیق کرنے لگے یعنی ایسی مخلوق
جو اس کے ہر دعویٰ کو باطل ٹھہرا سکے۔ اگر یہ سب ممکن نہیں تو قرآن ہمیشہ اپنی جگہ
قائم ہے۔ قرآن میں قیامت کی آمد کی علامات ملتی ہیں۔ لیکن وقت کا تعین کہیں

دیا گیا ہے۔ دنیا کے خاتمہ کی علامات بتائی گئی ہیں۔ لیکن دنیا کی حیات کا عرصہ کتنا ہے یہ نہیں بتایا گیا۔ سورج پلٹ دیا جائے گا۔ دریا خشک کر دئے جائیں گے پہاڑ ہٹا دیئے جائیں گے، کواکب گرا دیئے جائیں گے، زمین سب کچھ باہر نکال دے گی، لیکن یہ سب کب ہوگا اس کی خبر صرف ان کے خالق کو ہے۔ آدمی تو اپنی موت کی بھی خبر نہیں رکھتا چہ جائیکہ عالمین کی موت۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

قرآن حکیم ایک لازوال مشعل ہدایت ہے۔ زندگی کے جس گوشہ کو چاہیئے اس سے روشن کر لیجئے۔ جسے منظور ہو وہ اس سے اپنی بصیرت کو جلا دے۔ یہ فکر و تفقہ کا ابدی سرمایہ ہے جو صد ہا حجاب صورت معنیٰ لئے ہوئے ہے۔ لیکن کچھ کوتاہ نظر اور بے بصیرت لوگ اسے صرف محراب و منبر کی زینت سمجھتے ہیں۔ یا پھر آسیب و امراض خبیثہ سے نجات پانے کا منتر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کی آیات کا استعمال یا تو مسجدوں اور خانقاہوں میں ہے یا پھر چاندی کی طشتری پر سونے کے پانی سے لکھ کر دفع امراض و بابیات میں ہے بقول ان کے اگر قلب و ذہن میں ارض و سموات کی معروضی اور موضوعی حقیقتوں سے متعلق سوالات پیدا ہوں تو ان کو مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ سمجھ کر استغفار پڑھتے رہنا چاہئے لیکن خدا کا شکر ہے یہ طلسم ٹوٹتا جا رہا ہے۔ ہم نے تو ابھی خرد کی گتھیاں بھی نہیں سلجھائی ہیں۔ صاحب جنوں ہونے کی دعا مانگنے کا وقت تو ہمارے لئے آیا ہی نہیں۔ اس کے برعکس تو ہمارے علمی افلاس کا تو یہ عالم ہے کہ جو خرد کی گتھیاں سلجھا رہے ہیں انہیں ہم صاحب جنوں کے نام سے پکار رہے ہیں۔

مرض وصحت اور اسلام

مولانا سید جلال الدین عمری

صحت وتندرستی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے یہ جتنی بڑی نعمت ہے اتنی ہی عام بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات اس سے بہرہ یاب ہیں۔ صحت وتندرستی اس دنیا میں کسی بھی جاندار کی اصل حالت ہے۔ مرض اور بیماری اس کے لئے ایک عارض کی حیثیت رکھتی ہے۔ یا استثنائی صورت کی۔ انسان بھی بالعموم صحیح سالم اور تندرست پیدا ہوتا اور فطری طور پر نشو ونما پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس کے لئے انتہائی موزوں اور مناسب بنایا ہے۔ اور یہاں اس کے وجود وبقاء اور صحت وتندرستی کا پورا سامان رکھا ہے۔ اس سے وہ کسی محنت کے بغیر یا تھوڑی سی محنت سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔ ہوا پانی، روشنی اور حرارت پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ لیکن ان چیزوں کو مطلوبہ مقدار میں وہ اپنی سعی وجہد اور کوشش سے نہیں حاصل کرسکتا۔ لہٰذا ان چیزوں کی اسے جس مقدار میں اور جس تناسب سے ضرورت تھی یہ چیزیں اسی مقدار میں اور اسی تناسب سے بغیر کسی محنت کے عطا کیں۔ جن چیزوں کو وہ کسب ومحنت سے حاصل کرسکتا تھا ان کے اتنے بڑے ذخیرے رکھ دیے کہ ان کا حصول ان کے لئے ناممکن نہیں ہے۔ سلیقہ سے ان کا استعمال ہو اور انصاف کے ساتھ ان کی تقسیم ہو

تو سب ہی انسانوں کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو وسائل حیات پیدا کیے ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس نے انسان کو دل و دماغ اور اعضاء رئیسہ دیے، ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک اور دوسرے اعضاء و جوارح سے نوازا۔ یہی وہ آلات ہیں جن کی مدد سے وہ حسب حال اور ضرورت کے مطابق بقائے حیات کا بھی سامان کرتا ہے اور اپنی صحت کو بھی بحال رکھتا اور ترقی دیتا ہے۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کے جسم میں غیر معمولی قوت مدافعت رکھ دی ہے۔ جو اس کی صحت پر اثر انداز ہونے والے عوارض کا از خود مقابلہ کرتی رہتی ہے یہ قوت ان داخلی اور خارجی حملوں کا دفاع کرتی رہتی ہے۔ جو اس کی زندگی اور صحت پر مسلسل ہوتے رہتے ہیں۔ اور بڑی بڑی بے احتیاطیوں کے باوجود اسے زندہ و توانا رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے بیماری کے بعد وہ عموماً جلد صحت یاب بھی ہو جاتا ہے۔ اگر یہ قوت مدافعت، نہ ہوتی تو اس کی صحت ایک تو ذرا سی بے احتیاطی سے خراب ہو جاتی اور دوسرے یہ کہ خراب ہونے کے بعد آسانی سے ٹھیک بھی نہ ہو پاتی۔ انسان اسی وقت بیمار ہوتا ہے جبکہ وہ اللہ کی نعمتوں کو انتہائی غلط طریقے سے استعمال کرے۔ اور سخت بے احتیاطی سے اپنی قوتوں کو ضائع کرے۔

اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے اِذن سے ہوتا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ تکلیف و راحت، دکھ سکھ، اور مرض و صحت سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔ لیکن ایک مومن آسائش و راحت کو سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان اور تکلیف کو اپنی کوتاہی اور غفلت کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ صحت اور تندرستی کو بھی وہ اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا انعام تصور کرتا ہے۔ جو اسے بلا کسی استحقاق

کے ملا ہے۔ مرض اور تکلیف سے دوچار ہوتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ اس کی کوتاہیوں اور غفلتوں کا ثمرہ ہے۔ خدا نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے اسے یہ جرأت اور ہمت نہیں ہوتی کہ اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کو خدا کی طرف منسوب کرے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے، ایک جگہ فرمایا ہے:۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔ (الشعراء ۸۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کو اپنی طرف اور شفاء و تندرستی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ درحقیقت اپنی کوتاہیوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کا اعتراف ہے۔ یہ ایک بندۂ خدا کے عجز و انکسار کی بہترین مثال ہے۔

صبر کی ہدایت مصائب و مشکلات میں اسلام نے صبر کی ہدایت کی ہے۔ مومن کا ایک وصف خاص یہ ہے کہ وہ آزمائش میں ثابت قدم رہتا ہے۔ بیماری میں بھی وہ صبر کا دامن نہیں چھوڑتا۔ بیماری جتنی شدید ہو صبر بھی اسی لحاظ سے مطلوب ومحمود ہے، صبر مجبوری ولاچاری کا نام نہیں ہے۔ بلکہ صبر استقامت اور پامردی کو کہا جاتا ہے۔ صبر کوئی اضطراری کیفیت نہیں ہے، بلکہ صبر یہ ہے کہ پورے عزم وارادہ کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ بیماری کی حالت میں خاص طور پر اس وقت جبکہ بیماری شدید ہو صبر بہت مشکل کام ہے۔ لیکن جس شخص کو خدا اور آخرت پر یقین ہے وہ اگر چند پہلوؤں پر غور کرے تو یہ آسان بھی ہو سکتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کو صبر کا وصف بہت پسند ہے۔ اس کا اجر و ثواب بھی اس کے نزدیک بہت بڑا ہے۔ یہ اجر و ثواب اسی شخص کو ملتا ہے جو اس کے فیصلہ کو

بخوشی برداشت کرے۔ اگر وہ اس سے خوش نہیں ہے تو صبر کے اجر و ثواب سے محروم ہو گا، مرض اور صحت دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ مومن کو ہر حال میں راضی برضائے الٰہی ہونا چاہیئے۔ پھر اگر وہ یہ سوچے کہ بیماری کے مقابلہ میں اسے صحت زیادہ ملی ہے، تکلیف سے زیادہ اس نے آرام اُٹھایا ہے۔ صحت کے مقابلہ میں مرض کا تناسب ناقابلِ ذکر ہے تو اس کے اندر شکوہ و شکایت کی جگہ صبر اور شکر کا جذبہ ابھرے گا۔ یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ جزع و فزع اور خوف و ہراسانی سے مرض میں اضافہ تو ہوتا ہے ازالہ یا افاقہ نہیں ہوتا۔ مرض کو اگر وہ اللہ کا فیصلہ سمجھ کر بخوشی برداشت کرے تو اسے سکون اور راحت ملے گی۔ اس کے اندر بیماری کے مقابلہ میں طاقت پیدا ہو گی۔ اور صحت پر اس کے خوشگوار اثرات پڑیں گے بے صبری کا مظاہرہ کر کے انسان ان تمام نفسیاتی فوائد سے محروم ہو جاتا ہے۔

(۲) صبر و سکون کے ساتھ مرض کی تکلیفیں برداشت کرنے پر جس اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کو بار بار ذہن میں تازہ کرنے سے بھی صبر کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور مشکلات کو برداشت کرنے کی طاقت ابھرتی ہے حدیثوں میں آتا ہے کہ مومن کیلئے بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ اور درجات کی بلندی کا سبب ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مامن مصیبۃ تصیب المسلم
الا کفر اللہ بہا عنہ حتی الشوکۃ
یشاکہا بہا[1]

مسلمان کو جو بھی تکلیف پہونچتی ہے
یہانتک کہ جو کانٹا بھی اسے چبھتا ہے
تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے
گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب المرضیٰ، مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب ثواب المومن فی مایصیبہ الخ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز تھی میں ان کی خدمت میں پہونچا اور جسم مبارک کو چھو کر دیکھا تو بخار، بہت تیز تھا میں نے عرض کیا حضورؐ کو تو بڑی سخت تکلیف ہو رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تم میں سے دو آدمیوں کو جتنی تکلیف ہوتی ہے اتنی تنہا مجھے ہوتی ہے۔ میں نے کہا آپؐ کا اجر و ثواب بھی دوگنا ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا ہاں! پھر ارشاد فرمایا:-

ما من مسلم یصیبہ اذی شوکۃ فما فوقھا الا کفر اللہ بھا سیئاتہ کما تحط الشجر ورقھا[1]

جس مسلمان کو بھی کانٹا چبھنے کی یا اس سے بڑی کوئی تکلیف پہونچتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کی غلطیوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے درخت اپنے پتوں کو گرا دیتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ما یصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا ھم ولا حزن ولا اذی ولا غم حتی الشوکۃ یشاکھا الا کفر اللہ بھا من خطایاہ[2]

مسلمان کو جو تکان، یا مرض، فکر اور حزن، تکلیف اور غم لاحق ہوتا ہے یہاں تک کہ کانٹا جو اسے چبھتا ہے اس کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ اس کی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب المرضیٰ، باب اشد الناس بلاء، مسلم، کتاب البر والصلۃ۔
[2] بخاری، کتاب المرضیٰ، باب ما جاء فی ثواب المرض، مسلم، ابواب البر والصلۃ

حدیث میں آتا ہے کہ مریض کے ثواب کو دیکھ کر قیامت کے روز صحت مند انسان تمنا کریں گے کہ کاش وہ بھی بیمار ہوئے ہوتے، اور اس اجر و ثواب کے حقدار سمجھے جاتے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یود اھل العافیۃ یوم القیامۃ حین یعطی اھل البلاء الثواب لو ان جلودھم کانت قرضت فی الدنیا بالمقاریض۔[1]

جو لوگ عافیت میں ہیں، قیامت کے روز جبکہ مصیبت زدوں کو ثواب دیا جائے گا، یہ چاہیں گے کہ کاش! دنیا میں قینچیوں سے ان کی کھالوں کے ٹکڑے کر دیے جاتے (اور آج انہیں اس کا ثواب ملتا)۔

اگر اجر اور ثواب کا شعور تازہ ہو تو مریض کے لئے تکلیف کا برداشت کرنا بھی آسان ہوگا، اور اسے صبر و سکون بھی حاصل ہوگا۔

خدا کے ان نیک بندوں کا ذکر اور تصور بھی اس سلسلہ میں مفید ہوتا ہے۔ جنہوں نے مصائب و مشکلات اور بیماریوں میں صبر کا دامن نہیں چھوڑا، اور جن کی زبان پہ کبھی حرف شکایت تک نہ آیا، اس سے آدمی کو تسلی و تشفی اور سکون ملتا ہے اور شکر کا احساس ابھرتا ہے اس معاملہ میں حضرت ایوبؑ کا اسوہ بہترین اسوہ ہے انہوں نے مصیبت اور تکلیف میں صبر و شکر کی اعلیٰ مثال قائم کر دی ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ان کا ذکر اس طرح آیا ہے:

وَاَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ — اور یاد کرو جب ایوبؑ نے اپنے رب کو

---

[1] ترمذی ابواب الزہد۔

مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَذِكْرَىٰ لِلْعَابِدِينَ ۝

پکارا کہ مجھے تکلیف پہونچی ہے اور تو ارحم الرحمین ہے۔ ہم نے اس کی پکار سنی اور اسے جو تکلیف تھی وہ دور کر دی، ہم نے اسے اسکے اہل و عیال دیے اور اس کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیے، یہ رحمت ہے ہماری طرف سے اور عبادت کرنے والوں کے لئے نصیحت ۔

حضرت ایوبؑ کے صبر و ثبات اور انابت کا ذکر ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں ہوا ہے ۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ۝ ارْكُضْ بِرِجْلِكَ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنَثْ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ (۴۱۔۴۴)

اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کرو، جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے ہم نے اسے حکم دیا کہ، اپنا پاؤں زمین پر مارو لو یہ چشمہ ہے پانی ٹھنڈا نہانے کے لئے، اور پینے کے لئے ہم نے اسے اس کے اہل و عیال دیے، اور اتنے ہی اور بھی، یہ ہماری طرف سے رحمت تھی، اور نصیحت عقل والوں کیلئے اس نے ایک قسم کھا رکھی تھی ہم نے اس سے کہا کہ تنکوں کا ایک مٹھا لے، اور اس سے مار دے۔ اپنی قسم نہ توڑ، ہم نے اسے صابر پایا، بہترین بندہ اپنے رب کی طرف رجوع

کرنے والا ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوبؑ کسی بہت ہی سخت تکلیف دہ مرض میں مبتلا تھے ، اہل وعیال اور مال ومتاع کا بھی نقصان ہوا تھا ۔ لیکن انہیں نہ شکوہ ہے نہ شکایت وہ سمجھتے ہیں کہ بیماری ان ہی کی کسی فروگذاشت اور لغزش کا نتیجہ ہے ، شیطان نے انہیں کہیں دھوکا دیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں لیکن اپنے مصائب و آلام کی داستان نہیں سناتے اس لئے کہ اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے وہ انسان کے حالات سے خود اس سے زیادہ واقف ہے ۔ عرض مدعا اس سے زیادہ نہیں کرتے کہ اے رب کریم ! میں تکلیف میں مبتلا ہوں ، تو ارحم الراحمین ہے ، مطلب یہ کہ تجھ سے رحم وکرم کی توقع نہ کی جائے تو پھر کس سے کی جائے ، دعا اس قدر سوز و درد میں ڈوبی ہوئی تھی کہ در اجابت کھل گیا ، دعا سنی گئی ، اور صحت وعافیت عطا ہوئی ، ان کے دوسرے نقصانات کی بھی نہ صرف یہ کہ تلافی ہوئی ، بلکہ اللہ تعالے نے پہلے سے زیادہ نوازا ۔

مرض کی رعایت اسلام نے ایک طرف تو مریض کو صبر کی تلقین کی ، اور اجر و ثواب کی اسے بشارت دی ، دوسری طرف احکام شریعت میں اس کے ساتھ تخفیف اور رعایت کی ۔ اور اس کے لئے آسانیاں فراہم کیں ۔ تاکہ کوئی حکم اس کے لئے وقت طلب اور ناقابل برداشت نہ ہو ۔ جن احکام کی ادائیگی مریض کے لئے ممکن نہیں تھی ۔ ان سے اسے مستثنیٰ رکھا ۔

مریض نماز میں اگر کھڑا نہ ہو سکے تو اسے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہے ، اگر بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر پڑھ سکتا ہے ۔ اس پر بھی قادر نہ ہو تو صرف اشارہ سے نماز ادا کر سکتا ہے ۔ حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھے بواسیر کی شکایت تھی ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ نماز کیسے ادا کروں

آپؐ نے فرمایا :-

صَلِّ قَائِمًا فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَصَلِّ عَلٰی جَنْبٍ[۱]

کھڑے ہوکر نماز پڑھو، کھڑے ہوکر نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر پڑھو، یہ بھی نہ ہوسکے تو پہلو پر لیٹ کر پڑھو،

بعض دوسری حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکے تو صرف اشارہ سے پڑھ سکتا ہے[۲]

روزہ ایک مشکل عبادت ہے اور پورے رمضان کے روزے فرض ہیں اس لئے مریض کو یہ سہولت دی گئی ہے کہ اگر وہ رمضان میں روزے نہ رکھ سکے تو دوسرے دنوں میں ان کی قضا کرلے، چنانچہ ارشاد ہے :-

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ، (البقرہ ۱۸۶)

جو شخص مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرلے، اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔

حاملہ اور مرضعہ وغیرہ کو بھی اجازت ہے کہ وہ رمضان میں روزے نہ رکھ سکیں تو بعد میں قضا کرلیں[۳]

اسی طرح جو شخص بڑھاپے کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس سے کہا گیا کہ وہ روزہ کے بدلے کسی مسکین کو کھانا کھلا دے[۴]

---

[۱] بخاری، ابواب التقصیر، باب اذا لم یطق صلی علیٰ جنب، ترمذی ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء ان صلوٰۃ القاعد الخ، [۲] نیل الاوطار ۳/ ۲۴۲، ۲۴۳، [۳] ملاحظہ ہو ابوداؤد کتاب الصیام [۴] ہدایہ، ۱/ ۲۰۲

حالت احرام میں سر کا بال منڈوانا یا ترشوانا جائز نہیں ہے۔ لیکن مریض کو اس کی اجازت دی گئی ہے اور تلافی کے لئے فدیہ کا حکم دیا گیا ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (البقرہ، ۱۹۶)

تم میں سے جو مریض ہو، یا جس کے سر میں تکلیف ہو اور اس کی وجہ سے اپنا سر منڈوالے تو وہ فدیہ میں روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے،

جہاد سے معذوروں اور مریضوں کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ احکام جہاد کے ذیل میں ارشاد ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا (الفتح، ۱۷)

نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے، نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے، اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے (اگر وہ جہاد میں شرکت نہ کریں) اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا اللہ تعالیٰ اسے جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی اور جو شخص روگردانی کرے گا، اسے دردناک عذاب دے گا،

مرض کی وجہ سے انجام نہ پانے والے اعمال کا بھی ثواب ملتا ہے | ایک صاحب ایمان کو موت کا خوف تو نہیں ہوتا البتہ اس کا ضرور احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرائض و واجبات پورے نہیں کر رہا ہے۔ عبادت میں فرق آگیا ہے۔ دعوتی و تبلیغی جدوجہد میں کمی آگئی ہے۔ اللہ کے بندوں کی خدمت ٹھیک سے نہیں ہو رہی ہے یہ احساس بعض اوقات شدید ہوجاتا ہے اور اس کی صحت پر برا اثر ڈالتا ہے،